ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1912

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY, ISLAMABAD

کورس :اسلامی و مغربی تہذیب و افکار تاریخی تناظر میں(1912)

سطح :بی ایس علوم اسلامیہ

کلیہ عربی و علوم اسلامیہ) شعبہ اسلامی فکر، تاریخ و ثقافت(

سمسٹر :خزاں2026 ء(Semester: Autumn 2026)

امتحانی مشق نمبر 2 یونٹ نمبر 6 تا — (9 کل نمبر100 :، کامیابی کے نمبر50 :

SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ — برائے مطالعہ و حوالہ(For Study & Reference)

نوٹ :یہ گائیڈ صرف مطالعے اور حوالے کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ نصابی کتاب کے متعلقہ یونٹس کا مطالعہ کریں، مفاہیم کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر امتحانی مشق اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔ نقل شدہ یا ہو بہو کاپی کی گئی مشق قبول نہیں کی جائے گی۔

سوال نمبر :1 عالم اسلام میں مغربیت کے ناقدین کا تعارف لکھیں۔) نمبر(20 :

عالم اسلام میں مغربیت کے ناقدین کا تعارف لکھیں۔

تعارف

مغربیت سے مراد مغربی تہذیب کی اقدار، افکار اور طرزِ زندگی کو اس طرح اپنا لینا ہے کہ اپنی دینی و ثقافتی شناخت پس منظر میں چلی جائے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں جب مسلم دنیا سیاسی طور پر یورپی استعمار کے زیرِ اثر آئی تو ایک طبقہ مغرب کی مادّی ترقی سے مرعوب ہو کر مکمل مغربیت کی طرف مائل ہوا، مگر اس کے مقابلے میں عالمِ اسلام کے بڑے مفکرین نے مغربیت پر سخت تنقید کی اور خبردار کیا کہ مغرب کی ٹیکنالوجی لینا اور بات ہے اور اس کی تہذیب کو کلیتاً قبول کر لینا اور بات۔

ان ناقدین کی تنقید یکساں نہیں تھی :کسی نے فلسفیانہ بنیادوں پر مغرب کو رد کیا، کسی نے سیاسی و استعماری پہلو کو نشانہ بنایا اور کسی نے ادبی انداز میں مغربی تہذیب کی اخلاقی خامیوں کو بے نقاب کیا۔ مگر سب کا مرکزی نکتہ ایک تھا کہ اسلامی تہذیب کی بقا اپنی بنیادوں پر قائم رہنے میں ہے۔ ذیل میں ان ناقدین کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

علامہ محمد اقبال اور مغرب کی فلسفیانہ تنقید

مغربیت کے سب سے بڑے فلسفی ناقد علامہ محمد اقبال(1877 ء تا1938 ء (ہیں۔ اقبال یورپ میں قیام کے دوران مغربی تہذیب کو اندر سے دیکھ چکے تھے۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ مغرب کی علمی و سائنسی ترقی قابلِ قدر ہے، مگر ان کے

نزدیک مغربی تہذیب کی روح مادیت، سرمایہ پرستی اور اخلاق سے خالی عقل پرستی ہے۔ ان کا مشہور شعر ہے کہ مغربی تہذیب اپنے خنجر سے خودکشی کرے گی، کیونکہ جس شاخِ نازک پر اس کا آشیانہ ہے وہ ناپائیدار ہے۔

اقبال نے مسلمانوں کو مغرب کی اندھی تقلید سے روکا اور خودی، عشق اور دینی حمیت کی دعوت دی۔ انھوں نے "خطبات "میں اسلامی فکر کی تعمیر نو کا پروگرام پیش کیا اور کہا کہ اجتہاد کے ذریعے اسلام جدید دور کے مسائل کا جواب دے سکتا ہے۔ اقبال جمہوریت کی مادی صورت اور سرمایہ داری و اشتراکیت دونوں کے ناقد تھے، کیونکہ دونوں انسان کی روحانی قدر کو نظر انداز کرتی ہیں۔ ان کی تنقید نفرت پر مبنی نہیں بلکہ اصولی تھی؛ وہ مغرب کے علم کو لینے اور اس کی تہذیبی غلامی رد کرنے کے قائل تھے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مغربی افکار کا نظریاتی محاسبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی(1903 ء تا1979 ء) نے مغربیت کی تنقید کو نظریاتی اور تحریری محاذ پر منظم انداز میں پیش کیا۔ ان کی تصانیف" تنقیحات"،" اسلام اور مغربی تہذیب "اور" پردہ "میں مغرب کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی تصورات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ مودودی کے نزدیک مغرب کی بنیادی غلطی خدا سے کٹ کر انسان کو خود قانون ساز بنا دینا ہے، جس کا نتیجہ قوم پرستی، سرمایہ داری، بے لگام آزادی اور خاندانی نظام کی تباہی کی صورت میں نکلا ہے۔

مودودی نے سیکولرزم، لبرل ازم اور مغربی جمہوریت کی ان صورتوں پر تنقید کی جن میں اخلاقی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کا موقف تھا کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے، اس لیے مسلمانوں کو مغرب سے نظام درآمد کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ وہ جدید علوم و ٹیکنالوجی کے حصول کے مخالف نہیں تھے؛ ان کی تنقید مغربی افکار و اقدار پر تھی۔ انھوں نے متبادل کے طور پر اسلامی نظام کے قیام کی تحریک چلائی اور ان کی تحریروں نے پوری اسلامی دنیا کی نوجوان نسل کو متاثر کیا۔

سید قطب، محمد اسد اور مالک بن نبی

مصر کے مفکر سید قطب(1906 ء تا1966 ء) امریکہ میں قیام کے بعد مغربی معاشرے کی مادیت اور اخلاقی کھوکھلے پن کے سخت ناقد بن گئے۔ ان کی کتاب" الاسلام و مشکلات الحضارۃ "اور" معالم فی الطریق "میں جدید جاہلیت کا تصور

پیش کیا گیا، یعنی وہ نظام جو خدا کی حاکمیت کو رد کرے، خواہ وہ مغرب میں ہو یا مشرق میں۔ قطب کے نزدیک مغربی تہذیب روحانی دیوالیہ پن کا شکار ہے اور اس کے پاس انسانیت کو دینے کے لیے اخلاقی اقدار باقی نہیں رہیں۔

محمد اسد(1900 ء تا1992 ء، جو آسٹریا کے نومسلم مفکر تھے، نے" اسلام دوراہے پر (Islam at the Crossroads) " میں مسلمانوں کو خبردار کیا کہ مغرب کی زوال ان کی تہذیب کی موت ہے؛ مغرب کی طاقت اس کے علم میں ہے مگر اس کی تہذیب مادیت کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ الجزائر کے مالک بن نبی(1905 ء تا1973 ء (نے مسلمانوں کی" استعمار پذیری " (Colonizability)کا تجزیہ پیش کیا کہ زوال کی صل وجہ اندرونی کمزوری ہے، اور تہذیبی احیا کے لیے فکری و اخلاقی تعمیر نو ناگزیر ہے۔

جلال آل احمد، سید حسین نصر اور دیگر ناقدین

ایران کے ادیب جلال آل احمد(1923 ء تا1969 ء (نے اپنی مشہور کتاب "مغرب زدگی "میں مغربیت کو ایک بیماری سے تشبیہ دی جو مشین پر انحصار اور مغرب کی ذہنی غلامی کی صورت میں مشرقی معاشروں کو لاحق ہوئی۔ ان کے نزدیک مغرب زدہ انسان اپنی جڑوں سے کٹا ہوا اور نہ مشرق کا رہتا ہے نہ مغرب کا بن پاتا ہے۔ یہ تصور فارسی و عربی ادب میں وسیع پیمانے پر مقبول ہوا۔

سید حسین نصر) پیدائش1933 ء (نے مغربی سائنس و تہذیب کی تنقید فلسفۂ مابعد الطبیعات کی سطح پر کی۔ ان کے نزدیک جدید مغربی سائنس نے کائنات سے مقدس (Sacred) عنصر نکال دیا، جس کا نتیجہ ماحولیاتی بحران اور انسانی روح کی بے چینی ہے۔ ان کے علاوہ حسن البنا نے مسلم معاشرے کی اصلاح کی دعوت دی، علی شریعتی نے مغربی استعمار اور داخلی جمود دونوں پر تنقید کی اور اسماعیل الفاروقی نے مغربی علوم کی اسلام کاری کا نظریہ پیش کیا۔ ان سب ناقدین کی مشترکہ آواز یہی تھی کہ امت اپنی شناخت بحال کیے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔

اس فہرست میں سید ابوالحسن علی ندوی کا نام بھی نمایاں ہے جنھوں نے" اسلام اور مغرب "اور" مسلم ممالک میں اسلام اور مغربیت کی کشمکش "جیسی تحریروں میں اسی بحث کو آگے بڑھایا۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ مغرب کی نقل نہیں بلکہ اپنی قیادت و خودداری کا فقدان ہے۔ اسی طرح برصغیر میں اشرف علی تھانوی اور شبلی

نعمانی جیسے اہلِ علم نے بھی اپنے اپنے انداز میں مغربی تہذیب کے مادہ پرستانہ پہلوؤں پر تنقید کی اور نوجوانوں کو اپنی دینی روایت سے جوڑے رکھنے کی تلقین کی۔

نتیجہ

خلاصہ یہ کہ عالمِ اسلام میں مغربیت کے ناقدین، اقبال، مودودی، سید قطب، محمد اسد، مالک بن نبی، جلال آل احمد اور سید حسین نصر، نے مختلف اسالیب میں ایک ہی بنیادی بات کہی :مغرب کی سائنس و ٹیکنالوجی سے استفادہ مفید ہے مگر اس کی مادہ پرستانہ تہذیب، سیکولر اقدار اور طرزِ زندگی کو کلیتاً قبول کرنا اسلامی شناخت کے خاتمے کے مترادف ہے۔ ان ناقدین کی تنقید نے مسلم نوجوانوں میں خود اعتمادی پیدا کی اور تہذیبی احیا کی تحریکوں کی فکری بنیاد فراہم کی۔ آج بھی ان کے افکار مغربیت کے مقابلے میں ایک باوقار متبادل موقف پیش کرتے ہیں۔

سوال نمبر :2 استشراق کی تعریف کرتے ہوئے مستشرقین کے مختلف ادوار پر نوٹ لکھیں۔) نمبر(20 :

استشراق کی تعریف کرتے ہوئے مستشرقین کے مختلف ادوار پر نوٹ لکھیں۔

تعارف

استشراق (Orientalism) بیسویں صدی کی فکری بحثوں کا ایک اہم موضوع ہے، کیونکہ اس تحریک نے اسلام اور مشرق کے بارے میں مغرب کے تصورات کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا اور آج بھی ذرائع ابلاغ و اکیڈمیا میں اس کے اثرات موجود ہیں۔ مستشرقین نے ایک طرف اسلامی علوم کی تحقیق و اشاعت میں بڑا کام کیا اور دوسری طرف ان کی تحریروں میں تعصب اور اسلام دشمنی کے عناصر بھی پائے گئے، اس لیے اس موضوع کا غیر جانب دارانہ مطالعہ ضروری ہے۔

اس جواب میں پہلے استشراق کی لغوی و اصطلاحی تعریف بیان کی جائے گی، پھر مستشرقین کی سرگرمیوں کے مختلف تاریخی ادوار کا جائزہ لیا جائے گا، جن میں مذہبی مناظرے کا دور، علمی و استعماری دور اور جدید دور شامل ہیں، اور آخر میں ایڈورڈ سعید کی تنقید اور اس تحریک کے مجموعی اثرات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

استشراق کی تعریف اور مفہوم

استشراق عربی لفظ" شرق "سے نکلا ہے جس کے معنی مشرق کے ہیں؛ اس سے مراد مشرق، خصوصاً عالمِ اسلام، کا مطالعہ ہے۔ اصطلاحاً استشراق سے مراد مغربی اہلِ علم کی وہ تحریک ہے جس کے تحت انھوں نے مشرقی اقوام کی زبانوں، مذاہب، تاریخ، ادب اور تہذیب کا مطالعہ کیا اور ان پر کتابیں لکھیں۔ جو مغربی عالم مشرقی علوم کا مطالعہ کرے اسے مستشرق (Orientalist) کہا جاتا ہے۔

ابتدائی طور پر یہ مطالعہ کلیسا اور مسیحی مشنری مقاصد کے لیے تھا، پھر یہ جامعات میں باقاعدہ شعبہ بن گیا۔ مستشرقین نے عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں مہارت حاصل کی، مخطوطات جمع کیے، اسلامی کتب کے تراجم اور تنقیدی ایڈیشن شائع کیے اور بڑی بڑی انسائیکلوپیڈیائیں مرتب کیں۔ یوں استشراق ایک علمی تحریک بھی ہے اور ایڈورڈ سعید کے تجزیے کے مطابق مغرب کی مشرق پر علمی و تہذیبی بالادستی کا ایک نظام بھی۔ اس دوہرے کردار کو سمجھنا اس موضوع کی کنجی ہے۔

پہلا دور :مذہبی مناظرے اور قرونِ وسطیٰ

استشراق کا پہلا دور قرونِ وسطیٰ سے تعلق رکھتا ہے جب یورپ میں اسلام کو ایک حریف مذہب کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ اس دور میں مطالعے کا مقصد علم نہیں بلکہ اسلام کی تردید اور عیسائیت کا دفاع تھا۔ بارہویں صدی میں پطرس المبجل (Peter the Venerable) کی سرپرستی میں قرآن مجید کا پہلا لاطینی ترجمہ تیار ہوا تاکہ اس کی" غلطیوں "کو بے نقاب کیا جا سکے۔ اسی دور میں یوحنا دمشقی جیسے مسیحی مصنفین نے اسلام کو ایک بدعت کے طور پر پیش کیا۔

صلیبی جنگوں نے اس رجحان کو مزید ہوا دی؛ مسلمانوں کے بارے میں افسانوی اور خوفناک تصورات گھڑے گئے۔ اس دور کی تحریروں میں معروضیت نہ ہونے کے برابر تھی اور اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں آگے چل کر یورپی ذہن کا حصہ بن گئیں۔ تاہم اسی دور میں کچھ سنجیدہ کوششیں بھی ہوئیں، اور اسپین و سسلی کے ذریعے عربی علوم کا یورپ میں ترجمہ بھی اسی پس منظر میں شروع ہوا، جس نے بعد کی علمی تحریک کی بنیاد رکھی۔

دوسرا دور :سولہویں تا اٹھارویں صدی، علمی مطالعے کا آغاز

سولہویں صدی سے یورپی جامعات میں عربی کی باقاعدہ تدریس شروع ہوئی؛ لائیڈن، آکسفورڈ اور کیمبرج میں عربی کی کرسیاں قائم ہوئیں۔ اس دور میں لغات، صرف و نحو اور مخطوطات کے فہرست نامے تیار ہوئے۔ مطالعے کے مقاصد اب

بھی مذہبی تھے، کیونکہ عبرانی کے ساتھ عربی کو بائبل کے مطالعے کے لیے مفید سمجھا جاتا تھا، مگر علمی معیار بتدریج بہتر ہوتا گیا۔

اٹھارویں صدی میں روشن خیالی کے زیرِ اثر کچھ اہلِ علم نے اسلام کو نسبتاً غیر جانب داری سے دیکھا۔ دوسری طرف اسی دور میں یورپی طاقتیں ایشیا و افریقہ میں پیش قدمی کر رہی تھیں اور مستشرق مطالعہ رفتہ رفتہ نوآبادیاتی انتظامیہ کی ضرورت بننے لگا، کیونکہ محکوم اقوام کو سمجھے بغیر ان پر حکومت مشکل تھی۔ یوں استشراق کا علمی رخ استعماری مقاصد سے جڑنے لگا، جو اگلے دور میں کھل کر سامنے آیا۔

تیسرا دور :انیسویں صدی، استعمار اور علمی استشراق کا عروج

انیسویں صدی استشراق کا دورِ عروج ہے۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی اور ہالینڈ کی جامعات میں مشرقیات کے باقاعدہ ادارے قائم ہوئے۔ گولڈزیہر نے حدیث و اسلامی علوم پر تحقیقی کام کیا، نولڈیکے نے قرآن کی تاریخ پر لکھا، اسنوک ہرخرونیے نے انڈونیشیا و حجاز پر مطالعے کیے اور برصغیر میں بھی مستشرقین نے تاریخ و ادب پر وسیع کام کیا۔ اس دور میں "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" جیسے بڑے منصوبے شروع ہوئے۔

اسی دور میں بہت سے مستشرقین استعماری حکومتوں کے مشیر بنے اور ان کے مطالعے انتظامی و سیاسی مقاصد کے لیے استعمال ہوئے۔ ساتھ ہی اسلام کی تاریخ، سیرت اور قرآن کے بارے میں شکوک پیدا کرنے والی تحریریں بھی سامنے آئیں، جن کا مسلم اہلِ علم نے جواب دیا۔ اس دور کے کام میں علمی مہارت اور تعصب دونوں ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں :ایک طرف عربی مخطوطات کی حفاظت و اشاعت کا عظیم کام ہوا اور دوسری طرف مشرق کو پس ماندہ، جامد اور مغرب کی رہنمائی کا محتاج ثابت کرنے کی کوشش بھی ہوئی۔

چوتھا دور :بیسویں صدی سے جدید تنقیدی دور تک

بیسویں صدی میں استشراق دو سمتوں میں بٹ گیا۔ ایک طرف سنجیدہ علمی روایت جاری رہی جس میں مارشل ہاجسن، مونٹگمری واٹ اور این میری شمل جیسے محققین نے اسلام کو نسبتاً ہمدردانہ اور معروضی انداز میں پیش کیا؛ مونٹگمری واٹ نے سیرتِ نبوی پر لکھ کر بہت سی غلط فہمیاں دور کیں۔ دوسری طرف ایریا اسٹڈیز کے نام پر مطالعہ

سیاسی و تزویراتی مقاصد سے وابستہ رہا، خصوصاً سرد جنگ اور پھر دہشت گردی کے خلاف جنگ کے دور میں اسلام پر مطالعے سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے ہونے لگے۔

1978ء میں ایڈورڈ سعید کی کتاب" اورینٹلزم "نے اس پوری روایت پر بنیادی تنقید کی۔ سعید کے نزدیک استشراق محض علم نہیں بلکہ ایک ڈسکورس ہے جس کے ذریعے مغرب نے مشرق کی ایک خیالی تصویر بنا کر اپنی بالادستی کو جواز دیا۔ اس کتاب کے بعد استشراق پر بحث عالمی اکیڈمیا کا حصہ بن گئی۔ مسلم مفکرین نے بھی اس پر تنقید لکھی، البتہ بعض نے یہ بھی کہا کہ مستشرقین کے تحقیقی کام سے استفادہ اور ان کے تعصبات کا علمی جواب، دونوں ساتھ چلنا چاہیے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ کہ استشراق مغربی اہلِ علم کے ہاتھوں مشرق و اسلام کے مطالعے کی صورتوں پر محیط تحریک ہے جو قرونِ وسطیٰ کے مذہبی مناظرے سے شروع ہو کر علمی مطالعے، استعماری دور کی جامع تحقیق اور بالآخر جدید تنقیدی جائزے کے مراحل سے گزری۔ اس کے کارناموں میں مخطوطات کی حفاظت، تراجم اور بڑے علمی منصوبے شامل ہیں، مگر اس میں اسلام دشمنی، تعصب اور استعماری مقاصد کی آمیزش بھی رہی ہے۔ مسلمانوں کے لیے درست رویہ یہی ہے کہ مستشرقین کے کام کو تنقیدی نظر سے پڑھا جائے، مفید تحقیق سے فائدہ اٹھایا جائے اور غلط بیانیوں کا جواب جذباتی نعروں کے بجائے مضبوط علمی دلائل سے دیا جائے۔

سوال نمبر :3 مغربی تہذیب میں مذہب کی کیا حیثیت ہے؟ تفصیل لکھیں۔) نمبر(20 :

مغربی تہذیب میں مذہب کی کیا حیثیت ہے؟ تفصیل لکھیں۔

تعارف

مغربی تہذیب میں مذہب کی حیثیت کا سوال اس لیے اہم ہے کہ آج مغرب کو عموماً ایک مکمل سیکولر اور مذہب سے آزاد تہذیب سمجھا جاتا ہے، حالانکہ تاریخی حقیقت اس سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ مغربی تہذیب کی جڑوں میں یہودی و مسیحی روایت بھی شامل ہے اور یونانی عقل و فلسفہ بھی، اور ان دونوں کے باہمی کشمکش و امتزاج سے ہی مغرب کی مذہبی صورت حال تشکیل پائی ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں مغرب میں کلیسا کی مکمل بالادستی تھی، پھر نشاۃ ثانیہ، اصلاحِ مذہب اور روشن خیالی کے ادوار نے مذہب کے دائرے کو بتدریج محدود کیا، یہاں تک کہ جدید دور میں بیشتر مغربی ریاستوں نے سیکولرزم اختیار کر لیا۔ اس تفصیل میں مذہب کی مغربی تہذیب میں تاریخی حیثیت، سیکولر انقلاب، مذہب کی موجودہ صورت حال اور اس کے معاشرتی کردار کا جائزہ لیا جائے گا۔

قرونِ وسطیٰ :کلیسا کی بالادستی کا دور

قرونِ وسطیٰ میں مغربی یورپ میں مسیحیت محض ذاتی عقیدہ نہیں بلکہ پورے معاشرتی و سیاسی نظام کی بنیاد تھی۔ کیتھولک کلیسا کا سربراہ پوپ خود کو بادشاہوں سے برتر سمجھتا تھا، بادشاہوں کی تاج پوشی کلیسا کے ذریعے ہوتی اور تعلیم، اخلاق، قانون اور حتیٰ کہ سائنس پر بھی کلیسا کی نگرانی تھی۔ ماورائے عدالتوں میں مذہبی جرائم پر سزائیں دی جاتیں اور کلیسا کے عقائد سے اختلاف بدعت قرار پاتا جس کی سزا سخت تھی۔

اس دور کی تہذیب کے بڑے مظاہر، عظیم الشان گرجا گھر، خانقاہیں، جامعات اور فنونِ لطیفہ، سب مذہب کے گرد گھومتے تھے۔ تاہم کلیسا کی یہ آمریت خود مذہب کی روح کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ مغفرت ناموں کی فروخت، مذہبی مناصب کی خرید و فروخت اور پادریوں کی اخلاقی کمزوریوں نے عوام میں بے چینی پیدا کی۔ یوں مذہب کی حد سے بڑھی ادارہ جاتی بالادستی نے اپنے خلاف ردِ عمل کی زمین تیار کر دی۔

اصلاحِ مذہب، نشاۃ ثانیہ اور روشن خیالی

سولہویں صدی میں مارٹن لوتھر کی اصلاحی تحریک نے پوپ کی بالادستی کو چیلنج کیا اور پروٹسٹنٹ فرقہ وجود میں آیا۔ اس سے مسیحیت تقسیم ہو گئی، مذہبی جنگیں ہوئیں اور بتدریج یہ خیال پختہ ہوا کہ ریاست کو مذہبی تنازعات سے الگ رہنا چاہیے۔ نشاۃ ثانیہ نے انسان کو مرکز بنایا اور دنیاوی علوم و فنون کی طرف توجہ دلائی، جس سے مذہبی موضوعات کی ادبی و فنی گرفت کم ہوئی۔

سترہویں و اٹھارہویں صدی کی روشن خیالی نے عقل کو وحی پر مقدم قرار دیا۔ والٹیئر اور روسو جیسے مفکرین نے کلیسا پر سخت تنقید کی، ڈی ازم اور الحاد کے رجحانات پھیلے اور فرانسیسی انقلاب نے ریاستی سطح پر مذہب کی مخالفت کی

انتہا کر دی۔ سائنسی انکشافات، خصوصاً ارتقا کے نظریے، نے بائبل کی لفظی تشریحات کو چیلنج کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب کا دائرہ قانون، سیاست اور تعلیم سے نکل کر بتدریج نجی زندگی تک محدود ہونے لگا۔

سیکولرزم اور مذہب کی جدید حیثیت

جدید مغربی ریاستوں کی غالب اکثریت سیکولر ہے، یعنی آئین مذہب اور ریاست کی علیحدگی کی ضمانت دیتا ہے اور کسی مذہب کو ریاستی سرپرستی حاصل نہیں، البتہ مذہبی آزادی ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔ کچھ ممالک میں رسمی طور پر قومی کلیسا موجود ہے، مثلاً برطانیہ میں چرچ آف انگلینڈ، مگر عملاً سیاست میں اس کا کردار علامتی رہ گیا ہے۔ امریکہ میں آئینی طور پر ریاست مذہب سے الگ ہے لیکن سماجی زندگی میں مذہب یورپ کی نسبت زیادہ نمایاں ہے۔

اس نظام میں مذہب کی حیثیت ایک نجی اور رضاکارانہ معاملے کی ہے: ہر شخص اپنے عقیدے کا خود ذمہ دار ہے، کلیسا کی رکنیت اور عبادت میں حاضری ذاتی پسند پر منحصر ہے اور مذہبی اقدار قانون سازی کی بنیاد نہیں بنتیں۔ مذہبی اخلاقیات کی جگہ انسانی حقوق اور افادیت نے لے لی ہے۔ یوں مغربی تہذیب میں مذہب کو رد نہیں کیا گیا بلکہ اسے عوامی زندگی سے نجی دائرے میں منتقل کر دیا گیا ہے، اور یہی سیکولرزم کا اصل مفہوم ہے۔

موجودہ صورت حال :زوال، بقا اور نئے رجحانات

آج مغرب میں مذہب کی صورت حال مخلوط ہے۔ یورپ میں گرجا گھروں کی حاضری میں شدید کمی آئی ہے، بہت سے گرجا گھر بند یا فروخت ہو رہے ہیں اور نوجوان نسل کی بڑی تعداد خود کو غیر مذہبی قرار دیتی ہے۔ کرسمس اور ایسٹر جیسے تہوار مذہبی سے زیادہ ثقافتی و تجارتی رنگ اختیار کر چکے ہیں۔ شادی، خاندان اور جنسی اخلاق جیسے معاملات میں کلیسا کی تعلیمات کا عمل دخل کم ہو گیا ہے۔

دوسری طرف مذہب مکمل طور پر ختم بھی نہیں ہوا۔ امریکہ اور مشرقی یورپ میں مذہبی رجحانات نسبتاً مضبوط ہیں، پینٹاکوسٹل تحریکیں بڑھ رہی ہیں اور مہاجرین کی وجہ سے اسلام مغرب کا تیزی سے بڑھنے والا مذہب ہے۔ روحانیت کی تلاش نے یوگا، مراقبے اور مشرقی مذاہب میں دلچسپی پیدا کی ہے، اور اخلاقی سوالات، جیسے ماحولیات اور اسقاطِ حمل، پر مذہبی آوازیں اب بھی سیاست میں موجود ہیں۔ یوں مغربی مذہب ادارہ جاتی طور پر کمزور مگر انفرادی روحانیت کی صورت میں زندہ ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ مغرب میں مذہب کی اس بدلتی حیثیت نے بین المذاہب مکالمے اور مذہبی آزادی کے تحفظ جیسی نئی سرگرمیوں کو بھی جنم دیا ہے۔ بہت سے گرجا گھر اب کمیونٹی مراکز، خیراتی اداروں اور سماجی خدمت کے مراکز کے طور پر کام کرتے ہیں اور مذہبی جماعتیں مہاجرین کی مدد، غربت کے خاتمے اور امن کے فروغ میں حصہ لیتی ہیں۔ دوسری طرف نوجوان نسل میں زندگی کے معنی کی تلاش بھی بڑھ رہی ہے اور کچھ نوجوان روایتی مذہب یا نئی روحانی تحریکوں کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ ماہرین کے مطابق مذہب مغرب سے ختم نہیں ہو رہا بلکہ اپنی شکل بدل رہا ہے :ادارہ جاتی کلیسا کمزور ہے مگر ذاتی ایمان، اخلاقی حساسیت اور روحانی تلاش مختلف صورتوں میں آج بھی زندہ ہیں، اور اسلام کی صورت میں ایک منظم مذہبی روایت وہاں بڑھ رہی ہے۔

نتیجہ

مختصر یہ کہ مغربی تہذیب میں مذہب قرونِ وسطیٰ کی مکمل بالادستی سے گزر کر اصلاحِ مذہب اور روشن خیالی کے ردِ عمل کے بعد سیکولر نظام میں ایک نجی معاملے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ ریاست اور قانون اس سے الگ ہیں، گرجا کی سماجی گرفت کمزور ہو چکی ہے، تاہم مذہبی آزادی محفوظ ہے اور روحانی تلاش نئی صورتوں میں جاری ہے۔ اس حیثیت کا سب سے بڑا نتیجہ یہ ہے کہ مغربی معاشرہ اخلاقی رہنمائی کے لیے مذہب کی بجائے قانون اور انفرادی پسند پر انحصار کرتا ہے، جس کے مثبت و منفی اثرات اس کی معاشرتی زندگی میں واضح نظر آتے ہیں۔

سوال نمبر :4 مغربی میڈیا کے منفی کردار پر نوٹ تحریر کریں۔) نمبر(20 :

مغربی میڈیا کے منفی کردار پر نوٹ تحریر کریں۔

تعارف

میڈیا کو جدید معاشروں میں چوتھا ستون کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ عوامی رائے بناتا ہے، معلومات فراہم کرتا ہے اور حکمرانوں کا محاسبہ بھی کر سکتا ہے۔ مغربی میڈیا، خبر رساں ایجنسیاں، اخبارات، ٹیلی وژن چینل، فلمی صنعت اور اب سوشل میڈیا پلیٹ فارم، دنیا بھر میں اثر و رسوخ رکھتا ہے اور عالمی خبروں و ثقافت کی سمت متعین کرنے میں اس کا کردار سب سے بڑا ہے۔ تاہم آزادی و طاقت کے ساتھ یہ میڈیا بہت سے منفی کردار بھی ادا کر رہا ہے۔

اس نوٹ میں مغربی میڈیا کے منفی کردار کے اہم پہلو زیرِ بحث آئیں گے :کارپوریٹ ملکیت اور مفادات، اسلام و مسلمانوں کی منفی تصویر کشی، جنگی پروپیگنڈا اور جانبدارانہ کوریج، سنسنی خیزی و تجارتی دوڑ، فحاشی و اخلاقی تنزلی کا فروغ، جعلی خبریں اور صارفیت کی ترویج۔ اس کے ساتھ حل کی طرف اشارہ بھی کیا جائے گا۔

کارپوریٹ ملکیت، تجارتی مفادات اور سنسنی خیزی

مغربی میڈیا کا پہلا منفی پہلو اس کی ملکیت کی اجارہ داری ہے۔ دنیا کے بیشتر بڑے اخبارات، چینل اور ڈیجیٹل پلیٹ فارم چند بڑی کارپوریشنوں اور سرمایہ داروں کے پاس ہیں۔ جب خبر ایک کاروبار بن جائے تو اس کا معیار سچائی کے بجائے ریٹنگ اور اشتہارات کی آمدنی بن جاتا ہے۔ اسی تجارتی دباؤ کا نتیجہ سنسنی خیزی ہے :دلچسپ مگر غیر اہم خبریں سرخیوں میں آتی ہیں جبکہ غربت، ماحولیات اور پسماندہ دنیا کے مسائل پس منظر میں رہ جاتے ہیں۔

مشہور شخصیات کی نجی زندگی، اسکینڈلز اور جذباتی مواد کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے، اور آج سوشل میڈیا کے الگورتھم بھی اسی رجحان کو فروغ دیتے ہیں کیونکہ متنازع اور جذباتی مواد زیادہ دیکھا جاتا ہے۔ اس سے معاشرے کی فکری سطح گرتی ہے، کتاب و تحقیق کی جگہ سطحی معلومات لے لیتی ہیں اور عوامی گفتگو سنجیدہ مسائل کے بجائے ہنگاموں کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ یوں آزادی کے باوجود میڈیا عوام کی اجتماعی توجہ کو بگاڑنے کا سبب بنتا ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کی منفی تصویر کشی

مغربی میڈیا کے منفی کردار کا سب سے نمایاں پہلو اسلام اور مسلمانوں کی یک طرفہ اور منفی تصویر کشی ہے، جسے ایڈورڈ سعید نے بھی اپنی کتاب" کورنگ اسلام "میں بے نقاب کیا تھا۔ دہشت گردی کے واقعات کو اسلام سے جوڑ کر پیش کیا جاتا ہے، جبکہ دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے اسی نوع کے جرائم کو انفرادی واقعہ قرار دیا جاتا ہے۔ مسلمان کردار فلموں اور ڈراموں میں عموماً منفی، پسماندہ یا انتہا پسند دکھائے جاتے ہیں اور پردہ کرنے والی خواتین کو مظلوم و جبری زندگی کی علامت بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

اس کا نتیجہ مغربی معاشروں میں اسلاموفوبیا، مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز جرائم اور امتیازی رویوں کی صورت میں نکلتا ہے۔ مسلم ممالک کی مثبت خبریں، ان کی ترقی، ثقافت اور عام انسانوں کی زندگی مغربی خبروں میں شاذ ہی نظر آتی

ہے۔ چنیدہ ماہرین کے ذریعے" اسلام بمقابلہ مغرب "کا بیانیہ بنایا جاتا ہے۔ یہ تصویر کشی محض اتفاق نہیں؛ اس کے پس منظر میں سیاسی مقاصد اور دفاعی پالیسیوں کو جواز فراہم کرنے کی خواہش بھی کارفرما ہوتی ہے۔

جنگی پروپیگنڈا اور جانبدارانہ کوریج

جنگوں اور بین الاقوامی تنازعات میں مغربی میڈیا بارہا ریاست کے بیانیے کا ساتھی بن چکا ہے۔ عراق جنگ سے قبل بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیاروں کے دعوے بغیر جانچ کے پھیلائے گئے جو بعد میں غلط ثابت ہوئے۔ فلسطین کے مسئلے کی کوریج میں زبان کا انتخاب اس طرح ہوتا ہے کہ قبضہ اور مقبوض کو برابر دکھایا جائے یا ایک فریق کی ہلاکتوں کو غیر فعال اور مبہم الفاظ میں بیان کیا جائے۔

اسی طرح جن ممالک سے مغربی طاقتوں کے مفادات وابستہ ہوں، ان کی انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کم نمایاں ہوتی ہیں، جبکہ مخالف ممالک کی چھوٹی باتیں بھی عالمی سرخی بن جاتی ہیں۔ ویتنام جنگ کے بعد مغربی حکومتیں میڈیا مینجمنٹ کی باقاعدہ پالیسی رکھتی ہیں اور جنگی صحافیوں کو فوج کے ساتھ منسلک (Embedded) کر کے کوریج کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ یوں میڈیا محاسبے کے بجائے پروپیگنڈے کا آلہ بن جاتا ہے، جو اس کے "چوتھے ستون" کے دعوے کو کھوکھلا کرتا ہے۔

اخلاقی تنزلی، صارفیت اور جعلی خبریں

مغربی میڈیا کا ایک سنگین منفی کردار اخلاقی اقدار کی پامالی ہے۔ فلم، ٹیلی وژن اور اشتہارات میں فحاشی، عریانی اور تشدد کو تفریح کے نام پر عام کر دیا گیا ہے، جس سے نوجوان نسل کی اخلاقی تربیت متاثر ہوتی ہے اور خاندانی نظام کمزور پڑتا ہے۔ جسمانی خوبصورتی کے مصنوعی معیار نوجوانوں میں احساسِ کمتری اور ذہنی امراض پیدا کرتے ہیں، اور اشتہارات انسان کو ایک صارف بنا کر پیش کرتے ہیں جس کی خوشی خریداری سے وابستہ ہے۔

سوشل میڈیا کے دور میں جعلی خبروں (Fake News) اور غلط معلومات کا مسئلہ مزید سنگین ہو گیا ہے؛ انتخابات میں مداخلت، سازشی نظریات اور فرقہ وارانہ نفرت الگورتھم کے ذریعے تیز رفتاری سے پھیلتی ہے۔ پرائیویسی کی خلاف ورزی، ڈیٹا کا کاروبار اور توجہ کی معیشت (Attention Economy) نئے اخلاقی بحران ہیں۔ مجموعی طور پر مغربی

میڈیا معلومات کی فراہمی کے بجائے اذہان کی تشکیل اور بازار کی خدمت میں مصروف ہے، اور اس کے منفی اثرات اب خود مغربی معاشروں میں تشویش کا موضوع بن چکے ہیں۔

اس ضمن میں بچوں اور نوجوانوں پر میڈیا کے اثرات خصوصاً تشویش ناک ہیں۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ تشدد بھرے کھیلوں، فحش مواد اور گھنٹوں اسکرین کے سامنے گزارے گئے وقت نے بچوں کی توجہ، نیند اور اخلاقی نشوونما کو متاثر کیا ہے۔ سائبر بلینگ اور آن لائن استحصال جیسے جرائم بھی اسی غیر منظم میڈیا ماحول کی پیداوار ہیں۔ خود مغربی ممالک میں اب والدین، ماہرینِ نفسیات اور قانون ساز سوشل میڈیا کمپنیوں کے ضابطے اور بچوں کے تحفظ کے قوانین پر زور دے رہے ہیں، جو اس بات کا اعتراف ہے کہ مغربی میڈیا کا منفی کردار محض مخالفین کا الزام نہیں بلکہ ایک تسلیم شدہ عالمی مسئلہ ہے جس سے ہر معاشرے کو آگاہ رہنے کی ضرورت ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ کہ مغربی میڈیا آزادی اور تکنیکی مہارت کے باوجود کارپوریٹ مفادات، سنسنی خیزی، اسلام و مسلمانوں کی منفی تصویر کشی، جنگی پروپیگنڈے، اخلاقی تنزلی کے فروغ اور جعلی خبروں کی صورت میں نمایاں منفی کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کا حل میڈیا کی آزادی ختم کرنا نہیں بلکہ میڈیا خواندگی کو عام کرنا، متبادل اور ذمہ دار صحافت کو فروغ دینا اور مسلمان دنیا کا اپنا معیاری میڈیا کھڑا کرنا ہے، تاکہ عالمی بیانیے میں توازن پیدا ہو اور حقائق یک طرفہ تصویر کشی کی نذر نہ ہوں۔

سوال نمبر :5 عالم انسانیت کے اخلاقی تنزل میں مغربی تہذیب کا کیا کردار ہے؟ مفصل لکھیں۔) نمبر(20 :

عالم انسانیت کے اخلاقی تنزل میں مغربی تہذیب کا کیا کردار ہے؟ مفصل لکھیں۔

تعارف

انسانی تہذیب کی اصل عظمت اس کی مادّی ترقی سے نہیں بلکہ اس کی اخلاقی اقدار سے ناپی جاتی ہے۔ آج دنیا سائنس و ٹیکنالوجی کے عروج پر ہے، مگر اس کے ساتھ خاندان کا بکھراؤ، خودکشی و ذہنی امراض میں اضافہ، جرائم، منشیات اور اخلاق بے راہ روی بھی عالمی مسائل بن چکے ہیں۔ اس تناظر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس اخلاقی تنزل میں مغربی

تہذیب کا کیا کردار ہے، کیونکہ یہی تہذیب گزشتہ تین صدیوں سے دنیا کی رہنما ہے اور اس کی اقدار نوآبادیات، تجارت اور میڈیا کے ذریعے پوری دنیا میں پھیلی ہیں۔

اس تفصیلی جواب میں مغربی تہذیب کے ان فلسفوں اور عوامل کا جائزہ لیا جائے گا جنھوں نے اخلاقی تنزل میں کردار ادا کیا :مادیت و سیکولرزم، انفرادیت و بے لگام آزادی، خاندانی نظام کی کمزوری، جنسی انقلاب، سرمایہ داری و صارفیت، اور اخلاقی نسبیت۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کیا جائے گا کہ اس تجزیے کا مقصد مغرب کی ہر چیز کی نفی نہیں بلکہ اس مسئلے کی درست تشخیص ہے۔

مادیت، سیکولرزم اور اخلاق کی بنیاد کا خاتمہ

اخلاقی تنزل کی جڑ مغربی تہذیب کے اس فلسفیانہ موڑ میں ہے جس میں خدا اور وحی کو زندگی کے مرکز سے ہٹا دیا گیا۔ جب اخلاق کی بنیاد الٰہی حکم کے بجائے محض انسانی پسند، قانون یا اکثریت کی رائے بن جائے تو اخلاقی اقدار بدلتی ہوئی ریت کی طرح غیر مستحکم ہو جاتی ہیں۔ روشن خیالی کے بعد مغرب میں خدا کو سماجی زندگی سے الگ کر دیا گیا اور مذہب نجی معاملہ بن گیا، جس سے اخلاق کا وہ واحد و آفاقی معیار ختم ہو گیا جو ہر دور اور ہر قوم کے لیے یکساں ہو۔

مادیت نے انسان کی قدر و قیمت اس کی دولت، طاقت اور افادیت سے جوڑ دی۔ جب دنیا ہی سب کچھ ہو تو آخرت کی جواب دہی کا تصور ختم ہو جاتا ہے اور انسان اپنے فائدے کے لیے ہر حد پار کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے؛ کرپشن، استحصال اور دھوکا دہی اسی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔ نشو و نما پانے والے الحادی افکار نے نوجوان نسل کے سامنے زندگی کا کوئی بڑا مقصد باقی نہ رکھا، جس کے نتیجے میں بے معنویت، اضطراب اور خودکشی جیسے رجحانات بڑھے۔ یہ اخلاقی خلا آج خود مغربی مفکرین کے لیے تشویش کا باعث ہے۔

افرادیت اور بے لگام آزادی

مغربی تہذیب کا دوسرا اخلاقی عامل حد سے بڑھی انفرادیت (Individualism) ہے۔ اس فلسفے میں فرد کی خواہش کو سب سے بڑی قدر قرار دیا جاتا ہے اور معاشرے، خاندان اور مذہب کی پابندیوں کو آزادی کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جاتا

ہے۔ آزادی فی نفسہٖ ایک قدر ہے، مگر جب یہ بے لگام ہو جائے اور" میرا جسم، میری مرضی "جیسے نعروں میں اخلاقی حدود ہی ختم ہو جائیں تو آزادی بے راہ روی میں بدل جاتی ہے۔

اس انفرادیت نے اجتماعی ذمہ داری، قربانی اور دوسروں کے حقوق کا احساس کمزور کر دیا۔ بزرگوں کی خدمت، ہمسائے کے حقوق اور سماجی خدمت جیسی اقدار پس منظر میں چلی گئیں۔ شادی اور خاندان کو ذاتی خوشی کے معاہدے سمجھا جانے لگا جسے کسی بھی وقت توڑا جا سکتا ہے۔ نتیجتاً مغربی معاشروں میں خود غرضی اور تنہائی کا احساس بڑھا، معمر افراد اولڈ ہومز میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے اور انسانی تعلقات مفاد پرستی کی بنیاد پر قائم ہونے لگے۔ یہی انفرادیت جب میڈیا اور تعلیمی نظام کے ذریعے مشرقی معاشروں میں پہنچی تو وہاں بھی خاندانی اقدار متزلزل ہونے لگیں۔

خاندانی نظام کی تباہی اور جنسی بے راہ روی

مغربی تہذیب کے اخلاقی تنزل کا سب سے ظاہر مظہر خاندانی نظام کی کمزوری ہے۔ ضلاقی کی بلند شرح، شادی کے بغیر ساتھ رہنے کا رواج، تنہا ماؤں کے گھرانے اور شادی کی عمر میں مسلسل تاخیر نے خاندانی ادارے کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ بچے والدین کی محبت و تربیت سے محروم ہو کر ذہنی و اخلاقی مسائل کا شکار ہوتے ہیں، اور تحقیق یہ بتاتی ہے کہ ٹوٹے گھرانوں کے بچوں میں جرائم و منشیات کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔

1960ء کی دہائی کے جنسی انقلاب نے جنسی تعلقات کو شادی کے ادارے سے الگ کر دیا، مانع حمل وسائل اور میڈیا نے اس بے راہ روی کو عام کیا اور فحش مواد کی صنعت ایک بڑا کاروبار بن گئی۔ اس کے سماجی نتائج، جنسی بیماریاں، اسقاطِ حمل کی بلند شرح اور انسان خصوصاً عورت کی شے سازی(Objectification) ، سب کے سامنے ہیں۔ جب حیا اور عفت جیسی اقدار کو قدیم سمجھ کر رد کر دیا جائے تو پھر معاشرے میں احترام و تحفظ کا وہ ماحول باقی نہیں رہتا جس پر اخلاقی زندگی قائم ہوتی ہے۔ اسلام نے خاندان کو اخلاق کی پہلی درس گاہ قرار دیا تھا؛ اس درس گاہ کی کمزوری پوری انسانیت کے اخلاقی زوال کا سبب بنتی ہے۔

سرمایہ داری، صارفیت اور عالمی استحصال

معاشی میدان میں مغربی تہذیب کی سرمایہ دارانہ اقدار نے بھی اخلاقی تنزل میں بڑا کردار ادا کیا۔ منافع کو سب سے بڑی قدر قرار دینے سے سود، سٹہ، جوا اور استحصالی کاروبار عام ہوئے۔ صارفیت (Consumerism) نے انسان کی ضرورتوں کو مصنوعی خواہشات میں بدل دیا؛ اشتہارات ہر وقت یہ احساس دلاتے ہیں کہ خوشی مزید خریداری میں ہے۔ اس دوڑ نے قرضوں، ذہنی دباؤ اور عدم اطمینان کو جنم دیا، اور لالچ کو ایک اخلاقی برائی کے بجائے کامیابی کی علامت بنا دیا۔

عالمی سطح پر بھی اسی تہذیب کے ادوار میں غلاموں کی تجارت، نوآبادیاتی لوٹ مار اور وسائل کی ناہموار تقسیم جیسے اخلاقی جرائم ہوئے، جن کے اثرات آج کی عالمی غربت و ناہمواری میں موجود ہیں۔ نشہ آور اشیا کی تجارت اور اسلحے کی صنعت بھی منافع کی اسی منطق کی پیداوار ہیں۔ اس طرح اخلاقی تنزل محض انفرادی رویوں کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ ایک نظام کی صورت اختیار کر گیا جس نے پوری انسانیت کو متاثر کیا، کیونکہ عالمی ادارے، تعلیمی نصاب اور میڈیا اسی تہذیب کے زیرِ اثر ہیں۔

اخلاقی نسبیت اور اس کا مجموعی جائزہ

مغربی فکر میں اخلاقی نسبیت (Moral Relativism) کا نظریہ بھی تنزل کا سبب بنا، یعنی اچھائی و برائی کا کوئی آفاقی معیار نہیں، ہر ثقافت اور فرد کے اپنے معیار ہیں۔ اس نظریے نے اخلاقی تعلیم کو ناممکن بنا دیا، کیونکہ جب کسی رویے کو غلط کہنے کی بنیاد ہی ختم ہو جائے تو معاشرہ برائی کے خلاف اجتماعی آواز نہیں اٹھا سکتا۔ مابعد جدیدیت نے سچائی کے تصور کو بھی مشکوک بنا دیا، جس سے کردار سازی کا عمل مزید دشوار ہو گیا۔

البتہ انصاف کا تقاضا ہے کہ یہ بھی کہا جائے کہ مغرب کے اندر خود اس تنزل کے خلاف آوازیں موجود ہیں: مذہبی و اخلاقی احیا کی تحریکیں، خاندان کے تحفظ کی کوششیں اور ماحولیات و انسانی حقوق کی جدوجہد اسی معاشرے سے اٹھی ہیں۔ اسی طرح تنزل کی تمام ذمہ داری صرف مغرب پر ڈالنا درست نہیں؛ مشرقی معاشروں کی اپنی کمزوریاں بھی ہیں۔ مگر چونکہ مغربی تہذیب دورِ جدید کی عالمی رہنما تہذیب ہے، اس کے فلسفے، مادیت، بے لگام انفرادیت، خاندانی کمزوری اور صارفیت نے اخلاقی تنزل کو عالمی پیمانے پر فروغ دینے میں مرکزی کردار ادا کیا ہے، اور اس کا حل اخلاقی و روحانی اقدار کی بحالی ہی میں ہے۔

نتیجہ

نتیجتاً عالمِ انسانیت کے اخلاقی تنزل میں مغربی تہذیب کا کردار بنیادی اور کثیر الجہتی ہے :سیکولر مادیت نے اخلاق کی الٰہی بنیاد ختم کی، انفرادیت و بے لگام آزادی نے خاندان و معاشرے کی پابندیوں کو کمزور کیا، جنسی انقلاب نے حیا و عفت کی اقدار کو پامال کیا، سرمایہ دارانہ و صارفیت نے لالچ کو نظام بنا دیا اور اخلاقی نسبیت نے اچھائی و برائی کا معیار ہی ختم کر دیا۔ ان عوامل نے میڈیا و اشتہار کے ذریعے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ انسانیت کی اخلاقی نجات اسی میں ہے کہ مادّی ترقی کے ساتھ روحانی و اخلاقی اقدار کو دوبارہ زندگی کا مرکز بنایا جائے، جس کی مکمل صورت اسلامی تہذیب کی تعلیمات میں موجود ہے۔

USMAN NOTES www.usmannotes.com